بیادِ ابنِ صفی

راشد اشرف

۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء کی صبح ابن صفی اپنے گھر سے قریبی واقع آفس کی جانب روانہ ہوتے نظر نہیں آئے۔ ۲۶ جولائی کی صبح ان کے اہل خانہ ان کے پرستاروں کی موجودگی میں مٹی کا حق مٹی کے سپرد کر آئے تھے۔ وہ ۲۵ اور ۲۶ جولائی کی درمیانی رات اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے اور ناظم آباد میں واقع اپنے مکان کو چھوڑ گئے اور اپنے نئے مکان کا پتا بھی کسی کو دے کر نہیں گئے!

اب تو یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے بہت دور بسائی ہیں بستیاں

۲۶ جولائی کی صبح وہ ہاتھ تہ خاک ہوئے جو ۲۸ برس اپنے پڑھنے والوں کو نت نئے جہانوں کی سیر کراتے رہے۔ وہ ہاتھ جن کی جنبش میں ترنم تھا اور خاموشی میں شاعری۔ جن کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہا کرتی تھی۔ بقول سردار جعفری۔ "انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے۔ یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن۔ محبت ممکن ہے نہ نفرت۔ یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ ساز میں سوئے ہوئے نغمے انہی ہاتھوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم آغوشی کے لیے یہی سب سے پہلے آگے بڑھتے ہیں اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار، مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انہیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقتور بن جاتی ہیں۔"

لیکن سری ادب کے موجد ابن صفی کی موت کے ساتھ ان کا دور ختم نہیں ہوتا، شروع ہوتا ہے۔ بڑے ادیب کی زندگی اس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

چشم خود بربست و چشم ما کشاد

کم و بیش ۲۸ برس پیشتر ان کے فرزند احمد صفی نے کہا تھا کہ کبھی کبھی یہ غم حافظے کا سہارا لے کر لاشعور کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور آنکھوں کے راستے بہہ جاتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا، اس لیے کہ اب سے چند روز قبل میں ابن صفی کی بڑی صاحبزادی کو اپنے چہیتے ابو کی یادیں تازہ کرتے دیکھ رہا تھا، ساتھ میں احمد صفی بیٹھے تھے۔ ان کی ہمشیرہ کی بات ختم ہوئی تو احمد صفی کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو چکی تھیں۔

احمد صفی اس جانکاہ سانحے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"۲۴ جولائی کو ابو کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ معمول سے زیادہ اس لیے کہ اس بیماری کو تقریباً دس ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ابو پر درد کا پہلا اور شدید حملہ ۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کی رات کو ہوا تھا اور اس کے بعد صحت مسلسل خراب ہی رہی۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں بیماری شدت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹروں نے طویل معائنوں اور تکلیف دہ ٹیسٹوں کے بعد ایک خطرناک بیماری کا اندیشہ ظاہر کر دیا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں ابو کو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مزید معائنوں اور ٹیسٹوں نے لبلبہ میں کینسر کی تصدیق کر دی یعنی بات

کو ابو سمیت تمام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ اسپتال میں بہترین علاج اور توجہ سے ابو کی بیماری میں افاقہ ہو گیا۔ اسپتال سے گھر آنے کے بعد علاج جاری رہا لیکن بیماری کی وجہ سے ان کے جسم میں متواتر خون کی کمی واقع ہونے لگی۔ جمعرات ۲۴ جولائی ۱۹۸۰ء کو ابو کو بخار آ گیا جو اس وقت غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن رات ہوتے ہوتے بخار بہت تیز ہو گیا۔ دوسرے دن طبیعت میں خرابی کی وجہ سے میں (احمد) دیر سے سو کر اٹھا۔ امی نے بتایا کہ رات بھر ابو کی طبیعت بہت خراب رہی۔ ابو کو اس وقت بھی خاصا بخار تھا۔ جمعہ کا دن تھا چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کا ملنا بھی مشکل تھا۔ امی کے مشورے سے میں اور بھیا (ابرار صفی) رحمٰن بھائی کو لینے چلے گئے ڈاکٹر رحمٰن آئے تو ابو کا بخار تیز ہو چکا تھا۔ ان کی سانس اس قدر تیز تیز چل رہی تھی کہ بولنا دشوار تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن نے فوراً انجکشن منگوائے۔ جب انہوں نے انجکشن لگانے کے لیے ابو کی آستین سرکائی تو ابو نے منع کیا، میرے بازو اب مزید مت بھیدو۔ رحمٰن بھائی نے پاؤں کی رگ میں انجکشن لگایا۔ انجکشن لگنے اور دوا ملنے کے بعد ابو کی طبیعت بہتر ہو گئی اور انہوں نے عادتاً طبیعت سنبھلتے ہی باتیں شروع کر دیں۔ شام کے وقت افطار کے بعد عیادت کے لیے حسب معمول لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ ابو کو کافی تیز بخار تھا اس کے باوجود آنے جانے والوں سے تھوڑی بہت بات چیت کر رہے تھے۔ رحمٰن بھائی نے جاتے وقت بھیا سے کہا کہ اس وقت تو حالت قدرے بہتر ہے۔ انشاء اللہ صبح سب سے پہلے خون چڑھانے کا انتظام کریں گے۔ یہ ایک ایسی صبح کا ذکر تھا جو کبھی نہ آئی۔ اس رات مجھے (احمد) بھی کافی تیز بخار تھا میں ابو کے پاس سے اٹھ کر بڑے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہی سو گیا۔ رات کو ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ گھڑیاں دیر ہوئے ۲۶ تاریخ کا اعلان کر چکی تھیں۔ ابو نے سارے دن کے بعد اس وقت بیت الخلا جانے کو کہا۔ سارا دن اس قدر کمزوری رہی تھی کہ ہاتھ نہ اٹھتا تھا لیکن اس وقت خود اٹھے اور سہارا لے کر کمرے سے متصل باتھ روم گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو سانس نہایت تیزی سے چل رہا تھا۔ بھیا کو بلایا کہ پیٹھ سہلا دیں۔ امی نے فوراً بھیا کو جگایا۔ جب بھیا پیٹھ سہلا رہے تھے تو ابو نے کہا "ناحق تم لوگوں کو آدھی رات کو تنگ کر رہا ہوں، میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تھوڑی دیر میں اچانک تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ کراہنے کی آواز سن کر میں فوراً کمرے میں پہنچا، اس وقت تک ابو لیٹ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں چھت میں گڑی تھیں اور سانس چلنے کی وجہ سے پورا پلنگ ہل رہا تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے، امی اور بہنیں گھبرا کر رونے اور دعائیں مانگنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں اور بھیا ابو کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگے۔ ابو کی حالت دیکھ کر سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بھیا روتے جاتے تھے اور ابو کو جھنجھوڑتے جاتے تھے۔ افتخار (بھائی) فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر کی طرف دوڑ گیا۔ بھیا اور مجھ میں ابو کے پاس سے ہٹنے کی ہمت نہ تھی۔ امی اور بہنیں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ اچانک ابو نے زور سے سانس لی اور ان کے چہرے کا کرب یکسر دور ہو گیا۔ وہ بالکل پرسکون ہو گئے۔"

ابن صفی پر آفیشل ویب سائٹ کے نگراں کار جناب محمد حنیف نے مجھے احمد صفی صاحب کا مندرجہ بالا مضمون ارسال کرتے وقت تبصرہ کیا کہ "جب بھی میں اسے پڑھتا ہوں، میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔"

ابن صفی کی موت پر ان کی کہانیوں کی مستقل

فضا ئیں بھی مغموم و سوگوار لگتی ہیں۔ عمران کے قہقہے۔ بار فلیٹ پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ صفدر، جولیا، خاور، نعمانی، چوہان، ظفر الملک، جمن، سلیمان، جوزف اور یہاں تک کہ عمران جس نے کبھی مایوس ہونا نہ سیکھا تھا۔ سب کے سب غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی اداس تصویریں بنے بیٹھے ہیں۔ اُدھر کرنل فریدی کی کوٹھی پر بھی سوگوار فضا طاری ہے۔ کیپٹن حمید واقعی مغموم ہو گیا ہے اور اپنے خالی پائپ کو گھور رہا ہے۔ اور کرنل فریدی...... وہ فریدی جس نے کبھی حمید کے اس اظہار خیال پر کہ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں' کہا تھا "لغو خیال ہے میں کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا"۔ جس کی ڈکشنری میں مایوسی اور ناکامی جیسے الفاظ نہیں ملتے' وہ فریدی بھی آج افسردگی کے عالم میں اپنے بجھے ہوئے سگار کو یوں تک رہا ہے جیسے سگار کی آگ نہ ہو بلکہ ایک تابناک اور بھڑکتا ہوا شعلہ ہو جو یکایک سرد ہو گیا ہے۔ غم انگیز پرچھائیوں نے فریدی کے چہرے کو گھیر رکھا ہے۔ پہلی بار اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نظر آئے ہیں اور اس اندوہناک خیال سے اور زیادہ وحشت ہوتی ہے کہ کون آئے گا جو ان کے کرداروں میں روح پھونک سکے گا' ان میں جان ڈال کر فریدی کو واقعی فریدی اور عمران کو واقعی عمران بنا کر پیش کر سکے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کرداروں کی ہمہ گیریت اور ان کی کردار سازی کے فن سے جتنا ابن صفی واقف تھے کسی دوسرے کا اس کی گرد تک پہنچنا بعید از قیاس ہے۔

اپنے چہیتے 'ابو' کے گزر جانے کے بعد محض وہ ساتوں بہن بھائی ہی یتیم نہ ہوئے بلکہ اردو زبان کا سری ادب بھی یتیم ہو گیا۔

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

ڈوب جائے گا جو کسی روز خورشید انا
مجھ کو دوہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

ابن صفی ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء کو الہ آباد کے ایک گاؤں نارا میں صفی اللہ اور نذیراں بی بی کے گھر پیدا ہوئے۔ اردو زبان کے شاعر نوح ناروی رشتے میں ابن صفی کے ماموں لگتے تھے۔ ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم نارا کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک ڈی اے وی اسکول' الہ آباد سے کیا جبکہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم الہ آباد کے ایونگ کرسچن کالج سے مکمل کی۔ سن ۱۹۴۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں برصغیر میں تقسیم کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہنگامے فرو ہوئے تو تعلیم کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا لہٰذا بی اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے یہ شرط پوری کرنے پر ملی کہ امیدوار کو عرصہ دو برس کا تدریسی تجربہ ہو۔ سن ۱۹۴۸ میں عباس حسینی نے ماہنامہ نکہت کا آغاز کیا' شعبہ نثر کے نگران ابن سعید (پروفیسر مجاور حسین رضوی جو حیات ہیں اور الہ آباد میں مقیم ہیں۔ راقم کی ان سے فروری ۲۰۱۰ء میں گفتگو ہوئی تھی) تھے جبکہ ابن صفی شعبہ شاعری کے نگران مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف قلمی ناموں سے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھنے لگے۔ ان قلمی ناموں میں طغرل فرقان اور سنکی سولجر جیسے اچھوتے نام شامل تھے۔ جون ۱۹۴۸ء میں نکہت سے ان کی پہلی کہانی 'فرار' شائع ہوئی۔ ۱۹۵۱ء کے اواخر میں بے تکلف دوستوں کی ایک محفل میں کسی نے کہا تھا کہ اردو میں صرف فحش نگاری ہی مقبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ ابن صفی نے اس بات سے اختلاف کیا اور کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے فحش نگاری کے اس سیلاب کو اپنی تحریر سے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ اس پر دوستوں کا موقف تھا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا'

لوگ یہی کچھ پڑھتے رہیں گے۔ یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب ابن صفی نے ایسا ادب تخلیق کرنے کی ٹھانی جو بہت جلد لاکھوں پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ عباس حسینی کے مشورے سے اس سلسلے کا نام جاسوسی دنیا قرار پایا اور ابن صفی کے قلمی نام سے انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید کے کرداروں پر مشتمل سلسلے کا آغاز ہوا جس کا پہلا ناول 'دلیر مجرم' مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء کے عرصے میں ابن صفی پہلے اسلامیہ اسکول اور بعد میں یادگار حسینی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ اگست ۱۹۵۲ء میں ابن صفی اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آگئے جہاں انھوں نے کراچی کے علاقے لالو کھیت کے سی ون ایریا میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک رہائش اختیار کی۔ ان کے والد ۱۹۴۷ء میں کراچی آچکے تھے۔ (راقم نے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئے عمران سیریز کے ناول 'بھیانک آدمی' پر درج پتے کی مدد سے مذکورہ مکان ڈھونڈ نکالا جس کی تصاویر وادی اردو ڈاٹ کام پر دیکھی جاسکتی ہیں) اگست ۱۹۵۵ء میں ابن صفی نے بھیانک آدمی کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔ بھیانک آدمی' اسرار پبلیکیشنز' ۱۳۰ حسن علی آفندی روڈ' کراچی سے شائع ہوا تھا۔ مذکورہ ناول کو ماہانہ جاسوسی دنیا نے نومبر ۱۹۵۵ء میں کراچی کے ساتھ ساتھ الہ آباد سے بہ یک وقت شائع کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ابن صفی نے اسرار پبلیکیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت جاسوسی دنیا کا پہلا ناول 'ٹھنڈی آگ' شائع کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ابن صفی لالوکھیت سے کراچی کے علاقے ناظم آباد منتقل ہوگئے۔

جنوری ۱۹۵۹ء میں ابن صفی' اسرار پبلی کیشنز کو فردوس کالونی' کراچی۔۱۸ کے نئے پتے پر منتقل کر چکے تھے اور یوں انھیں اپنی تخلیقات کو پروان چڑھانے کے لیے ایک آرام دہ ماحول میسر آگیا۔ ناظم آباد کے اس گھر میں وہ ۱۹۸۰ء میں اپنے انتقال تک مقیم رہے۔ راقم کی ویب سائٹ وادی اردو پر اس مکان کی تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں۔ خاص کر اس کمرے کی تصویر بھی موجود ہے جس میں وہ اپنی لازوال کہانیاں تخلیق کیا کرتے تھے اس کے علاوہ بوگن ویلیا کے اس پودے کی تصویر بھی شامل ہے جسے ہمارے محبوب مصنف نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

یہاں اس بات کا ذکر اہم ہے کہ ترقی کے موجودہ دور میں جہاں کمپیوٹر اور بالخصوص انٹرنیٹ کا استعمال گھر گھر ہونے لگا ہے اور انٹرنیٹ تیز تر معلومات کے حوالے سے ایک انتہائی اہم ذریعہ بن چکا ہے ابن صفی کے متعلق بھی خاصی معلومات انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ اس ضمن میں ابن صفی ڈاٹ انفو کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ ویب سائٹ وادی اردو ڈاٹ کام' جس کا اجرا جولائی ۲۰۰۹ء میں کیا گیا' پر بھی ابن صفی کے حوالے سے چند اہم معلومات' تصاویر اور ویڈیوز دستیاب ہیں۔ ابن صفی ڈاٹ انفو اور وادی اردو پر استاد محبوب نرالے عالم' جو ابن صفی کی کہانیوں کے ایک زندہ و جاوید کردار تھے' کے بارے میں ایک طویل تحقیقی مضمون بمع استاد کی چند نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ فرزند ابن صفی' جناب احمد صفی نے ۲۰۰۹ء میں مشہور ویب سائٹ فیس بک پر ابن صفی کے خصوصی صفحے کا آغاز کیا جسے ابن صفی کے چاہنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تادم تحریر مذکورہ صفحے کے ممبران کی تعداد تقریباً ۱۰۰۰ تک جا پہنچی ہے۔ راقم الحروف نے ابن صفی کے دیرینہ دوستوں اور ایسی شخصیات جو ابن صفی کے بارے میں مستند رائے رکھتی ہیں' سے ملاقات کرکے ان کے خیالات کو ویڈیو کی شکل میں ریکارڈ کیا اور یہ تمام

ویڈیو کلپس مشہور زمانہ ویب سائٹ یوٹیوب پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں عبید اللہ بیگ اور کمال احمد رضوی جیسے نابغہ روزگار اشخاص کی آرا شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شاہد منصور، شکیل صدیقی، انوار صدیقی (انکا، اقابلا اور سونا گھاٹ کا پجاری کے مصنف) اور فلمی اداکار و پروڈیوسر جاوید شیخ نے بھی اپنے تاثرات ریکارڈ کروائے۔ یاد رہے کہ جاوید شیخ کو ابن صفی نے فلم دھماکہ میں ماضی کی اداکارہ شبنم کے بالمقابل متعارف کروایا تھا۔ اس فلم کے مصنف ابن صفی تھے، ہدایتکار قمر زیدی جبکہ فلمساز محمد حسین تالپور عرف مولانا ہپی تھے۔ فلم دھماکہ ۲۹ دسمبر سن ۱۹۷۴ کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ بدقسمتی سے فلم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر پائی اور مولانا ہپی دل برداشتہ ہوکر اندرون سندھ واپس چلے گئے جہاں سے وہ کراچی کی فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی خاطر آئے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن 'مولانا' کبھی میڈیا کے سامنے نہیں آئے اور نہ ہی ان کی کوئی تصویر یا انٹرویو کہیں شائع ہوا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ راقم الحروف ایک عرصے سے اس تگ و دو میں تھا کہ کسی صورت مولانا ہپی سے رابطہ ہو سکے۔ حال ہی میں یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی اور ایک مہربان (میجر امین) کے ذریعے مولانا ہپی سے رابطہ ممکن ہو پایا۔ لیکن تاحال مولانا ہپی کی مصروفیات کی بنا پر ان سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے۔

ابن صفی ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ احمد صفی سے روایت ہے کہ ابن صفی کے الہ آباد یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تذکرے 'ملک ادب کے شہزادے' میں ان کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز ابن صفی سے ہمیشہ اس بات پر خفا رہے کہ اس نے اسرار ناروی کو قتل کر دیا تھا۔ ابن صفی کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

راہِ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
مے خانے سے دار تلک اپنی ہی کہانی بکھری ہے
رند بنے سرمستی میں کچھ اور بڑھے منصور ہوئے
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے یہ تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں
لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستاں

دل فسردہ ہی سہی چہرے پہ تابانی ہو
ورنہ خودداری احساس پہ حرف آتا ہے

غم حیات کی دریا دلی نہ پوچھ اسرار
یہ لہلہاتی بہاریں اسی سحاب کی ہیں

اور اس شعر کی داد تو ابن صفی شاید مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔

گھٹ کے رہ جاتی ہے رسوائی تک
کیا کسی پردہ نشیں سے ملیے

ابن صفی کی شاعری میں اگر سادگی و پرکاری کی کیفیت کا اندازہ لگانا ہو تو پھر یہ اشعار ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں

مرے لبوں پہ یہ مسکراہٹ!
مگر جو سینے میں درد سا ہے
اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں
اگر یہی گھر کا راستہ ہے

اور ان کے مندرجہ ذیل شعر کو ان کی ناگہانی وفات کے پس منظر میں دیکھیے تو دل دکھ سے بھر آتا ہے

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے
ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے

جناب احمد صفی کی فراہم کردہ ابن صفی کی ایک آزاد نظم دیکھیے

محترم مہر دوستو
وہ جو خاموش ہیں جانے کب بول اٹھیں
اس لیے چند چاندی کے تمغے منگاؤ
اور نگراں رہو
جیسے ہی لب کشا ہو کوئی
ایک چاندی کا چمچہ.......
اب تمہیں کیا بتاتا کہ تم
خود ہی دانا ہو صدیوں سے
چاندی کے اوصاف سے باخبر ہو
عقل و دانش کے پیکر ہو تم
دیدہ ور اور طباع ہو
تیغ اٹھاؤ گے تو تیغ ہی پر اسے
روک لے گا کوئی
دیدہ ور دوستو
صرف چاندی کا چمچہ
تمہارے مسائل کا حل ہے اسے یاد رکھنا

شاعر لکھنوی نے ابن صفی کو بحیثیت شاعر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”شاید عام ذہنوں میں یہ تاثر ہو کہ ابن صفی کی شاعری کا معیار غالباً وہ نہ ہوگا جو ان کے جاسوسی ذہن کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کے پٹری بدل لینے کو اسی کا نتیجہ سمجھتے ہوں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ان کی نظموں کی رنگارنگی، غزلوں کی جذباتی اور فنی آرائش اس تاثر کی نفی کرتی ہے بلکہ ہمیں اس بات کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کی جاسوسی تحریروں کی کشش خوبصورتی اور سحر انگیزی میں ان کے شاعرانہ مزاج کی کارفرمائی بڑی حد تک موجود ہے۔ اگر وہ شعر و ادب کی راہ سے ہو کر اس منزل پر نہ آتے تو شاید ان کی تحریروں میں سحریت اور اثر انگیزی کی وہ گھلاوٹ بھی نظر نہ آتی۔ شعر سب سے بڑا جادو ہے اور غزل سب سے بڑی جادوگر۔ ان کی جاسوسی تحریریں پڑھنے والوں پر جو سحر کاری کرتی ہیں وہ ان کے غزل شناس مزاج ہی کی مرہون منت ہے اور اسی لیے ان میں پڑھنے والوں پر جادو کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت ملتی ہے۔ ایک جاسوسی ناول نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے وہ میرے ایک شناسا کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی غزلوں اور نظموں کے عمیق مطالعے کے بعد مجھے یہ تمنا ہے کہ کاش وہ میرے دوست ہوتے۔ جہاں تک غزل میں فنی رکھ رکھاؤ، خیال کی ترتیب و تہذیب، الفاظ کے در و بست اور معانی کی بزم آرائی کا تعلق ہے، اسرار ناروی کے یہاں یہ خصوصیات اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ موجود ملتی ہیں۔“

شاعری میں ابن صفی کے منفرد اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایونگ کرسچین کالج الہ آباد میں ابن صفی کے استاد پروفیسر انوار الحق نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ ”اسرار جو شاعری کے میدان میں ابھرنے والا تھا، جاسوسی ناول نگار کیسے بن گیا؟“

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن صفی کے تخلیق کردہ ۲۳۵ ادب پاروں کا جائزہ لینے سے ہمیں ان میں ابن صفی کا ادبی و شاعرانہ تخیل بطریق احسن نظر آتا ہے۔

جون ۱۹۶۰ء میں ابن صفی جاسوسی دنیا کا ۸۸واں ناول پرنس وحشی اور عمران سیریز کا ۳۱واں ناول بے آواز سیارہ لکھ چکے تھے کہ ان پر شیزوفرینیا نامی بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک وہ مکمل طور پر صاحب فراش رہے۔ اس دوران بازار میں طرح طرح کے جعلی صفیوں کی بھرمار ہوگئی۔ (راقم نے چند ایسے ہی جعلی لکھنے والوں کے ناموں اور ان کی تحریروں کے نمونے وادی اردو پر شامل کیے ہیں۔)۔ ان میں نجمہ صفی (جس کے بارے میں خود صفی صاحب نے کہا تھا کہ میرے نام سے ملتے جلتے قافیے والی ایک صاحبہ بہت عرصے

سے غلط فہمی پھیلا رہی ہیں جبکہ میرے والد صاحب بھی ان کے جغرافیے پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں)' ابن صفی ابن صفی الیس قریشی ابن صفی اور اس قبیل کے بہت سے دوسرے شامل تھے۔

ابن صفی کی بیماری کے متعلق ان کے فرزند احمد صفی اپنے مضمون 'ابن صفی۔ چند حقائق' میں بیان کرتے ہیں کہ ''اس بیماری میں ڈیپریشن اور اختلاج بنیادی اثرات ہوتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات نے نیویارک میں اس پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بہت سے تخلیق کار اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے ذہن کی کارکردگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ بہت تیزی سے بہت عمدہ تخلیقات کے ڈھیر لگا دیتے ہیں (جیسا کہ ابن صفی کے قارئین نے دیکھا کہ ایک مہینے میں چار چار ناول تیار ہو جاتے تھے)۔ اس درجہ پر پہنچنے کے بعد ذہن اچانک اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے اور نہ صرف تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں بلکہ ایک مسلسل ڈیپریشن اور اختلاجی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کے زیر اثر وہ کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ انہی ماہر نفسیات کے مطابق جس طرح یہ بیماری آتی ہے اسی طرح اچانک پیچھا بھی چھوڑ سکتی ہے اور ابن صفی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں حکیم اقبال حسین کے علاج کے دوران وہ اچانک نارمل ہو گئے۔''

ابن صفی نارمل کیا ہوئے ان کے نقالوں کی تو گویا موت واقع ہو گئی۔ وہ جاسوسی ادب کے میدان میں واپس آئے تو اس شان سے کہ عمران سیریز کا ناول 'ڈیڑھ متوالے' لکھا جو ایک انتہائی دلچسپ ناول ہے۔ ناول کیا ہے؟ لکھا لکھایا اسکرپٹ ہے کہ فلم بنانے کے لیے لوکیشنز منتخب کی جائیں اور بلا تامل فلم بندی کا آغاز ہو جائے۔ ابن صفی کے کئی ناولز پر جاسوسی' نفسیاتی' مہماتی اور آرٹ فلمیں بنائی جا سکتی ہیں کہ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ چھیڑا ہو۔ ان میں محدود پیمانے پر موروثی ہوس' موت کی آندھی' گیارہواں زینہ' دوہری پہچان' پتھر کی چیخ' گارڈ کا اغوا' شاہی نقارہ' سائے کی لاش جیسے شاہکاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ابن صفی کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی۔ بنیادی طور پر چونکہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر تھے اسی لیے ان کے ناولوں کے نام بھی ان کے ادبی و شاعرانہ ذوق کے عکاس ہوتے تھے: ٹھنڈی آگ' سہمی ہوئی لڑکی' تاریک سائے' سبز لہو' لاش گاتی رہی' آوارہ شہزادہ' چاندنی کا دھواں' چمکیلا غبار' چیختے دریچے' ٹھنڈا سورج' خوشبو کا حملہ وغیرہ وغیرہ۔

ابن صفی نجی زندگی میں ایک درمندانہ دل رکھنے والے انسان تھے۔ ان کے برادر نسبتی جناب مبین احسن سے روایت ہے کہ ''ایک مرتبہ اسرار بھائی (ابن صفی) نے میرے محکمے کے ایک ملازم کی ترقی کے بارے میں مجھ سے کہا اور ان صاحب کی ترقی اتفاقاً میرے ہی دستخط سے ہوئی' یہ الگ بات ہے کہ یہ صاحب انہی (ابن صفی) کے لیے مار آستین ثابت ہوئے۔''

مرزا حیدر عباس بیان کرتے ہیں کہ ''ایک آدمی نے ابن صفی کے ساتھ فراڈ کیا۔ ابن صفی نے مقدمہ کر دیا۔ اس آدمی کو سزا ہو گئی۔ جب معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے تو انہیں اپنے پاس سے وظیفہ دینا شروع کر دیا۔''

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں مستقل کرداروں سے قطع نظر چند ایسے کردار تخلیق کیے جو ذہنوں سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور خیر و شر کے جیتے جاگتے نمونے بن کر سامنے آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار ان کے ناول ''لاشوں کا آبشار'' کا مسٹر کیو بھی ہے جو کسی شخص کی ناجائز اولاد ہوتا ہے۔ درجنوں انسانوں کے

قاتل کی حیثیت سے وہ عدالت میں اپنا بیان دیتا ہے اور جو کچھ ابن صفی اپنے اس کردار کی زبانی کہہ گئے ہیں وہ قابل غور ہے۔ ایک ایسا نازک و حساس موضوع ہے جس پر قلم اٹھانے کی جرات بڑے بڑوں کو نہ ہوئی۔ مذکورہ ناول کے اختتام پر مسٹر کیو قانون کی حراست میں ہوتا ہے اور بھری عدالت میں چند لمحے وہاں موجود مجمع کو گھورتا ہے اور پھر گرج کر کہتا ہے۔

"میں ایک شخص کی ناجائز اولاد ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کرتا؟ مجھے جواب دو۔ اگر کوئی مادر زاد لنگڑا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مادر زاد اندھے ہندوؤں میں سورداس اور مسلمانوں میں حافظ جی کہلاتے ہیں۔ لیکن میں...... میں کیا بذات خود ایک بہت بڑی مجبوری نہیں تھا؟...... کیا میں ایک بیماری کی طرح پیدا نہیں ہوا تھا؟ اگر میں شاستر پڑھ لیتا تب بھی ناجائز ہی رہتا...... اگر قرآن بھی حفظ کر لیتا تو لوگ مجھے حافظ کہتے ہوئے ہچکچاتے...... آخر کیوں...... کیا میں بھی ایک لنگڑے اور اندھے کی طرح اپنی پیدائش کے معاملے میں بے بس نہیں تھا؟ میں تمہارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ اس نے ناجائز کو کیوں اپنے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟...... وہ جس کا میں نطفہ ہوں' اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا ہو تو لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سورگ کی آس لگائے بیٹھا ہو گا۔ لیکن میں...... میں کس طرح خود کو بدل سکتا ہوں...... میں ناجائز ہوں' کوئی عادت نہیں کہ بدل جاؤں...... میں ماضی' حال اور مستقبل تینوں سے محروم ہوں۔ حال میں اس لیے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے تو میں اس سے بھی مایوس ہوں اس لیے کیونکہ بعض مذہب ناجائز کو ہر حال جہنمی قرار دیتے ہیں نہ کہتے ہیں کہ ناجائز ہر حال میں مرنے سے قبل خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے۔ چلئے ناجائز کو راہ مستقیم سے بھی محروم کر دیا گیا۔ پھر آخر کیا کرے۔ کہاں جائے...... بتاؤ نا! بولو...... جواب دو۔"

ابن صفی اپنے ذاتی نظریے میں صرف اور صرف اللہ کی "ڈکٹیٹر شپ" کے قائل تھے جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب کے پیشرس میں کہا تھا کہ "میں معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ چاہتا ہوں۔ تم انفرادی طور پر اپنی حالت سدھارتے جاؤ' پھر دیکھو کتنی جلدی ایسا معاشرہ بن جاتا ہے۔ جس پر اللہ کی حاکمیت ہو۔" ناول 'پاگلوں کی انجمن' سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"تمہارا ظاہر کچھ بھی ہو لیکن مسلمان ہونا چاہیے۔ کچھ نیکیاں سچے دل سے اپنا کر دیکھو۔ آہستہ آہستہ تم خود ہی کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنا ظاہر بھی اللہ کے احکامات کے مطابق بنا لو گے۔ قرآن کو پڑھو اسی پر عمل کرو اسے علم الکلام کا اکھاڑہ نہ بناؤ۔"

اسی طرح ایک سوال کے جواب میں کہ "آپ سیاست کے کس ازم کے قائل ہیں۔" ان کا کہنا تھا۔

"میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جتنے پیگ کا نشہ ہو ویسا ہی بیان داغ دیا۔ آپ بھی کسی ازم میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں اور کسی ایک ازم کی دشواری زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا سبب بنتی رہتی ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی بھی ازم حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلامی نظام حیات آج بھی قابل عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ایماندار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے۔ بس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام ہے اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام۔"

اسی مذہبی پس منظر میں دیکھیے تو ابن صفی کی شخصیت کا ایک اور دلنواز پہلو سامنے آتا ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری سن ۱۹۷۲ میں ابن صفی پر لکھے اپنے ایک مضمون اردو میں جاسوسی افسانہ میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں: ''ایک جگہ ابن صفی نے صلواتیں کا لفظ استعمال کیا ہے جو طباعت میں ''ص'' سے ہے مگر ذیلی حاشیے میں مصنف نے یہ نوٹ لگایا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے اور وہ خود ''س'' سے سلواتیں لکھتے ہیں اور اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں لکھتے ہیں۔ ''صلواتیں'' گالیوں کے معنوں میں نثر و نظم کے اساتذہ استعمال کرتے آئے ہیں لیکن انہوں نے ہمیشہ اس لفظ کو ''ص'' سے لکھا ہے۔''

مجنوں صاحب کے مذکورہ مضمون کے حاشیے میں ایچ اقبال صاحب کا نوٹ ملاحظہ ہو جو انہوں نے پروفیسر صاحب کے ابن صفی پر متذکرہ اعتراض کے جواب میں تحریر کیا۔

''میں نے ابن صفی صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''صلوات'' کا ربط خاص ''صلوات بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' سے ہے اس لیے وہ احتراماً اس لفظ کو برا بھلا کہنے کے معنوں میں استعمال نہیں کرتے اور جب اس کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے تو اسے ''س'' سے لکھتے ہیں۔''

عالمی افق کی ہمہ وقت بدلتی صورت حال پر ابن صفی کی ہمیشہ گہری نظر رہی۔ ترقی پسند تحریک ہو یا پھر وطن عزیز کے لیے ایٹمی پراسسنگ پلانٹ کا حصول ان کی تحریروں میں جا بجا ان معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے دیرینہ دوست اور شاعر و ادیب جناب شاہد منصور نے اسی موضوع پر اپنے ایک مضمون میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ہمارے ملک پر بھی ایک ایسا وقت آن پڑا تھا کہ یار لوگوں نے مبینہ پاکستان کو سرخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس گمبھیر وقت کا سامنا کرنے میں بھی ابن صفی صف اول میں سینہ سپر تھے۔ انہوں نے پے در پے اپنے کئی ناولوں میں نہ صرف اس مسئلے کو اٹھایا بلکہ ان ریشہ دوانیوں کا بھی بڑی جابکدستی سے پردہ فاش کیا جو سفارتی ہتھکنڈوں سے ثقافتی سرگرمیوں کے پردے میں کی جا رہی تھیں۔ یہاں میں (شاہد منصور) آپ کی خدمت میں ابن صفی کی ایک دھماکہ خیز غزل پیش کر رہا ہوں جو ان کی کتاب 'پاگلوں کی انجمن' (سن اشاعت۔ ۱۹۷۰ء۔ راقم) میں استاد محبوب نرالے عالم کی زبانی پیش کی گئی تھی۔ ذرا اس کے پُر معنی طنز اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ابن صفی کا سینہ کیسے دینی جوش سے پُر تھا اور اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر کس طرح انہوں نے اپنے عہد کی خوفناک زہرناکی کا مقابلہ کیا۔

اک دن جلال جبہ و دستار دیکھنا
ارباب فکر و فن کو سر دار دیکھنا
سنتے رہیں کسی بھی دریدہ دہن کی بات
ہم بھی کھلے تو جوش گفتار دیکھنا
قرآں میں ڈھونڈتے ہیں مساوات احمریں
یارو! نیا یہ فتنۂ اغیار دیکھنا
وردِ زباں ہیں خیر سے آیات پاک بھی
ہے اہرمن یہ خرقہ و پندار دیکھنا
کل تک جو بت کدے کی اڑاتا تھا دھجیاں
اس کے گلے میں حلقۂ زنار دیکھنا
لائی گئی ہے لال پری سبزہ زار میں
ہوتے ہیں کتنے لوگ گناہ گار دیکھنا
فرصت ملے جو لال حویلی کے درس سے
اک بوریہ نشیں کے بھی افکار دیکھنا

ابن صفی ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نگار تھے۔

مزاح لکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اسٹیفن لیکاک مزاح کی تعریف کچھ اس طرح سے بیان کرتا ہے۔

"یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے۔ جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔"

ابن صفی نے اس فنکارانہ اظہار میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جاسوسی دنیا کا کردار قاسم اور استاد محبوب نرالے عالم اس کی چند بہترین مثالیں ہیں۔ قاسم کا کردار ایک ڈیل ڈول اور عقل سے پیدل کردار ہے۔ جو کیپٹن حمید کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے اور مختلف موقعوں پر حمید اور کرنل فریدی کے لیے جہاں مشکلات پیدا کرتا ہے وہاں کئی مہمات میں ان کے لیے سہولت کار کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ابن صفی اپنے ناولوں میں ایسی پرلطف صورت حال پیدا کرتے تھے کہ ان کے قارئین بے چینی سے کہانی میں ان کرداروں کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔ سچویشنل کامیڈی کی ایک بہترین مثال عمران سیریز کا ناول 'چار لکیریں' ہے۔ جس کا ابتدائی جملہ پڑھ کر بے اختیار حلق سے قہقہہ ابل پڑتا ہے۔ کہانی میں کچھ یوں ہوتا ہے کہ کیپٹن فیاض اپنے ایک جاگیردار دوست کے یہاں بسلسلہ پارٹی مدعو کیے گئے۔ وہ جاگیردار صاحب عمران کے ساتھ اکٹھے آکسفورڈ میں پڑھتے رہے تھے۔ پارٹی کے انعقاد کے سلسلے میں دعوت ناموں کا انتظام تھا۔ کیپٹن فیاض کی جو شامت آئی تو اس نے عمران کے دعوت نامے پر مسٹر اینڈ مسز عمران لکھ دیا۔ کچھ تو تفریح کی خاطر اور کچھ یہ سوچ کر بھی کہ شاید عمران روشی (ایک طرحدار عورت) کو بھی ساتھ لیتا آئے گا جس کی خوش مزاجی کیپٹن فیاض کو بے حد پسند تھی۔ اب ناول کا ابتدائی جملہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت کیپٹن فیاض کی کھوپڑی ہوا میں اڑ گئی جب اس نے عمران کے ہمراہ شہر کی ایک طوائف دیکھی۔"

بقیہ صورت حال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ معززین و شرفا کی اس تقریب میں عمران صاحب جس طوائف کو اپنے ہمراہ قیام کے لیے لے گئے تھے اس کی وجہ سے وہاں کیا کیا نہ حماقتیں پھیلی ہوں گی۔

اسی طرح عمران سیریز کے ایک ناول "بحری یتیم خانہ" کی ابتدا ایک نائٹ کلب میں کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کے ساتھ ہوتی ہے (یہاں ابن صفی اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں چوٹ کرتے نظر آتے ہیں)۔ عمران صاحب وہاں موجود تھے۔ استاد للکار ٹھمری شروع کرتے ہیں اور 'نندیا کاہے مارے بول' کی جو تکرار شروع کرتے ہیں تو عمران سات منٹ کے انتظار کے بعد استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"حضور! اب آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی' آپ مجھے اپنی نندیا کا پتہ بتائیں میں ابھی دوڑ کر پوچھ آتا ہوں کہ نندیا کاہے مارے بول۔"

استاد کی تنک مزاجی مشہور تھی۔ انہوں نے پہلے تو عمران کو حیرت سے دیکھا' پھر سرمنڈل پھینک کر عمران کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی ہنگامہ ہو گیا۔ کسی نے پوچھا کہ یہ کیا بے ہودگی ہے تو عمران صاحب غصیلے لہجے میں بولے" ان کی نندیا میری بھی رشتے دار ہیں۔ میں ان کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ پبلک مقامات پر ان کی توہین کرتے پھریں"۔ اتنے میں منیجر بھی آپہنچا' اس نے عمران کی شکل دیکھی تو بری طرح گڑبڑا گیا۔

"کیا بات ہے جناب عالی' وہ گڑگڑایا۔ عمران نے استاد للکار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا' باجہ بجا کر میری عزیزہ کی توہین کر رہے ہیں جناب۔"

ادھر استاد دہاڑے "ارے یہ بہرام خان حرام خان کا کوئی لگتا ہے حرامی۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں جناب" عمران ادب سے بولا "میں آپ کی تندیا کا سالا ہوں۔"

ابن صفی کے ناولوں کے پیش رس بھی اپنی جگہ کلاسیکی درجہ رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو وہ اپنے قارئین سے نوک جھونک کے موڈ میں رہا کرتے تھے۔ بعض پڑھنے والے ان کو کس کس طرح کے سوالات کرکے بور کیا کرتے تھے اور وہ ان کو ایسے جوابات دیا کرتے تھے کہ بیجا اور نامناسب تنقید کرنے والے کٹ کر رہ جائیں۔

جاسوسی دنیا کے ایک ناول کے پیش رس میں ٹنڈو آدم کے ایک ٹیلیفون آپریٹر ابن صفی کے سابقہ ناول کو محض بکواس قرار دیتے ہیں' ان کی دانست میں ناول کے نام سے اس کے پلاٹ کا کوئی میل نہ تھا۔ ابن صفی لکھتے ہیں کہ ٹیلیفون آپریٹر صاحب نے آتشی بادل کا اشتہار دیکھ کر اس کے بارے میں کچھ اس قسم کی کہانی خود بنائی ہوگی کہ آگ برساتا ہوا ایک بادل ہے جو تمام شہر پر مسلط ہو گیا ہے' عمارتیں دھڑا دھڑ جل رہی ہیں پھر عمران اخیر میں اپنی پناہ گاہ سے قہقہے لگاتا ہوا برآمد ہوتا ہے اور اس سائنسدان کا ٹینٹوا دباتا ہے جو ایک مشین کے ذریعے آتشی بادل بنا بنا کر فضا کو سپلائی کر رہا تھا۔

آخر میں ابن صفی اپنے مخصوص انداز میں ایک ایسی بات لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اچھل پڑے۔

"یار ٹنڈو آدمی صاحب! خود ہی لکھ کر پڑھا کرو۔"

غور فرمایا آپ نے "ٹنڈو آدمی" کی نادر ترکیب پر۔

اسی طرح چاٹگام سے ایک صاحب ابن صفی کو کتابیں لکھنا ترک کرکے ترکاری بیچنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ابن صفی ان صاحب کو ایک طویل سنجیدہ جواب دیتے ہیں لیکن اخیر میں چٹکی لینے سے باز نہیں آتے۔

"بھئی اپنا نام تو صاف لکھا کریں۔ پہلی نظر میں 'بدھو داس' معلوم ہوتا ہے۔ غور کرو تو 'روپس راس' پڑھا جاتا ہے۔ ذرا ترچھا کرکے دیکھو تو 'چلو واپس گھسیٹا ہوا' معلوم ہوتا ہے۔"

یہاں اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ ابن صفی کہنے کو تمام عمران کا نام استعمال کرکے جعلی لکھنے والوں سے نالاں نظر آئے لیکن ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے وقت ان کی روایتی خوش مزاجی و بذلہ سنجی غالب رہی۔ مثال کے طور پر عمران سیریز کے ناول ڈیڑھ متوالے کے پیش رس میں وہ اپنے پڑھنے والوں سے عرصہ تین برس بعد یوں مخاطب ہیں۔

"رہی مختلف قسم کے ابنوں اور صفیوں کی بات تو یہ بیچارے سارے قافیے استعمال کر چکے ہیں لہٰذا اب مجھے کسی 'ابن فضی' کا انتظار ہے' میری دانست میں تو اب یہی قافیہ بچا ہے۔"

ایک دوسری جگہ اسی ضمن میں شکوے کا دلنشیں، بذلہ سنج انداز ملاحظہ ہو کہتے ہیں۔

"مجھے ان کماؤ پوتوں پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ بس صرف اتنی سی بات گراں گزرتی ہے کہ لکھنے والے اپنے باپ کا نام بتانے کے بجائے میرے ہی باپ کا نام بتانے لگتے ہیں۔ وہ بھی اس انداز میں کہ میں ہی معلوم ہوں اور وہ ایک آدھ نکتے کے فرق سے کتابیں خریدنے والوں کو دھوکہ دے سکیں۔ ویسے آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ وہ یہ کہ باپ کا نام بتائے بغیر کوئی جاسوسی ناول نویس کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر شرط یہ ہے کہ نام میرے ہی باپ کا بتایا جائے۔"

ابن صفی کے ناولوں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں کہ جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر کہیں غلطی سے وہ مروجہ 'ادب' کے میدان میں باضابطہ قدم رکھ دیتے تو بڑے بڑوں کی چھٹی ہو جاتی اور اس لحاظ سے چار حروف لکھ کر اہل کمال ہو جانے والوں کو ابن صفی کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے ان کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا۔

(۱) "اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ انہیں قناعت کا سبق پڑھانے کی بجائے ان کی خودی کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔ اللہ بھی اس پر یہ جرم نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کر لے۔"

(۲) "ان کا طرز حکومت جمہوری کہلاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مغز چند آدمیوں کے حصے میں آئے اور ہڈیاں عوام کے سامنے ڈال دی جائیں۔ یہ اپنے مسائل طاقت ہی سے حل کرتے ہیں مگر اسے اشتراک باہمی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے حاکم خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں۔ عوام ہی انہیں حکومت کے لیے منتخب کرتے ہیں لیکن یہ ان کی مالی قوت ہی ہوتی ہے جو انہیں اقتدار کی کرسی پر پہنچاتی ہے لیکن وہ اسے عوام کی قوت اور رائے عامہ کہتے ہیں۔ حالانکہ رائے عامہ مالی قوت ہی سے خریدی جاتی ہے۔ انہیں منتخب ہونے کے لیے اپنے مخالفوں کے خلاف بڑے بڑے محاذ قائم کرنے پڑتے ہیں۔ ایک خطرناک جنگ شروع ہوتی ہے اور اس جنگ کو رائے عامہ ہموار کرنا کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی طاقت ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ آخر ایک آدمی مخالفوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔"

(۳) "ہماری زمین کے سینے میں کیا نہیں ہے؟ مگر ہم مفلس ہیں   کاہل ہیں   ہمیں باتیں بنانی آتی ہیں۔ ہم تقریر کر سکتے ہیں ایک دوسرے پر اپنی ذہنی برتری کا رعب ڈال سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں ضائع کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم سے تعمیری کام نہیں ہو سکتے۔"

(۴) "میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم 'جرائم' نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔"

(۵) "تربیت ضروری چیز ہے۔ یہ کیا کہ ایک معمولی کلرک کو کلرکی کا امتحان دینا پڑے۔ ایک پولیس کانسٹیبل رنگروٹی کا دور گزارے بغیر کام سے نہ لگایا جائے لیکن ترکاریوں کے آڑھتی' بے مروت جاگیردار اور گاؤدی قسم کے تاجر براہ راست اسمبلیوں میں جا بیٹھیں اور قانون سازی فرمانے لگیں اور ان ہی میں سے کچھ کابینہ کے ارکان بن جائیں' سوچنے کی بات ہے کہ نچلی سطح پر امتحانات اور ٹریننگ کا چکر چلتا رہے اور اوپر جس کا دل چاہے پہنچ جائے۔ بس جیب بھاری ہونی چاہیے نہ کوئی امتحان اور نہ کوئی ٹریننگ۔"

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ فن کردار نگاری جو کسی بھی کہانی' افسانے یا ناول کا بنیادی وصف ہوتا ہے ابن صفی کے قلم کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام حاصل کر چکا ہے۔ ارفع و اعلیٰ ادب کے "رہنماؤں" کو پتا ہی نہ چلا کہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کے دن ان کے درمیان سے کس بلا کا اور کس غضب کا کردار نگار اٹھ گیا۔ ادب کے ان رہنماؤں کی نظر میں جرم و سزا کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جرائم کس طرح سماج کو تنزلی کی جانب دھکیلتے ہیں۔ جرائم اور سماج کی مثال آندھی اور جھونپڑیوں کی سی ہے' ازل ہی سے جرائم انسانی زندگی اور سماج پر آندھیوں کی طرح جھپٹے آئے اور ان کے تدارک کے لیے اچھے سے اچھا ادب پیدا کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اسے تیسرے درجے کا ادب قرار دے کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ناانصافی ہے۔ انگریزی ادب میں جاسوسی کردار نگاری کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ایڈگر ایلن پو (۱۸۰۹۔۱۸۴۹) زیڈگ از

والٹر (۱۷۷۸_۱۶۹۴)' (تھری مسکیٹرز از الیگزینڈر ڈوما (۱۸۷۰_۱۸۰۲)' ہیومن کومیڈی از بالزاک (۱۸۵۰_۱۷۹۹) مون اسٹون از وکی کولنز (۱۸۸۹_۱۸۲۴) بلیک ہاؤس از چارلس ڈکنز (۱۸۷۰_۱۸۱۲) گن فار سیل از گراہم گرین وغیرہ وغیرہ۔

اردو ادب کی کئی نامور شخصیات ابن صفی کے فن کو سراہتی نظر آتی ہیں۔ جون ایلیا سے روایت ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک بار کہا تھا کہ اس شخص (ابن صفی) کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔ ان کے علاوہ جن اشخاص نے ابن صفی کی برملا تعریف کی ہے ان میں پروفیسر حسن عسکری' پروفیسر مجنوں گورکھپوری' ڈاکٹر ابو الخیر کشفی' ابراہیم جلیس' سرشار صدیقی' شاعر لکھنوی' رئیس امروہوی' جون ایلیا' امجد اسلام امجد' کالم نگار حسن نثار' شاعر و فلمی کہانی نویس جاوید اختر' عبید اللہ بیگ (مشہور ٹی وی پروگرام کسوٹی کے میزبان) منیر حسین (مشہور کرکٹ کمینٹیٹر) معراج رسول (جاسوسی و سسپنس ڈائجسٹ) پروفیسر گوپی چند نارنگ' بشریٰ رحمن' قاضی اختر جونا گڑھی' ڈاکٹر خالد جاوید (جن کی نگرانی میں جامعہ ملیہ دلی میں ابن صفی کے ناولوں کے حوالے سے ایم فل اور ایک پی ایچ ڈی کی تھیسس جمع ہونے والی ہے)' شاہد منصور' صحافی و ادیب مشتاق احمد قریشی' پروفیسر انوار الحق' حریت کے کالم نگار و مشہور ادیب و صحافی نصر اللہ خان وغیرہ وغیرہ۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ابن صفی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اردو کے ممتاز افسانہ نگار سید محمد اشرف نے "ذہن جدید" کے ادب نما میں اردو کے دس بڑے لکھنے والوں میں ابن صفی کا نام لیا ہے۔

یہاں محترم رئیس امروہوی کا ابن صفی کے انتقال کے بعد مندرجہ ذیل بیان گویا اعترافی بیان سمجھا جانا چاہیے۔ ابن صفی پر اپنے مضمون' جوئے خوں بہتی ہے' میں رئیس صاحب لکھتے ہیں۔

"جب تک ابن صفی زندہ تھے' ہم سمجھتے تھے کہ ہم ان سے بے نیاز ہیں لیکن اب ہمیں اپنی محرومی اور نیاز مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کس بے شرمی۔ اور سنگ دلی سے اپنے ایک باکمال ہم عصر کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ یہاں "ہم" سے مراد عام قاری نہیں کہ وہ تو ابن صفی کا عاشق تھا۔ "ہم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناول' افسانے اور داستان سرائی کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

سن ۲۰۰۹ء میں راقم کے نام ایک ای میل میں پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ بھی ابن صفی کے پڑھنے والوں میں شامل تھے۔

جامعہ ملیہ نئی دہلی کے استاد اور مصنف ڈاکٹر خالد جاوید نے ایک بار کہا تھا کہ "ابن صفی اردو میں ایک روایت کا نام ہیں مگر یہ روایت ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ ہماری تنقید نے ان کے ساتھ۔ کا یا سوتیلا' کسی قسم کا برتاؤ نہیں کیا۔ یہ اسی قسم کی صورت حال ہے جیسے اعلیٰ قسم کا فلم بین طبقہ اور سنیما کے ناقدین نصیر الدین شاہ کے ساتھ دلیپ کمار کا نام لیتے ہوئے ہونٹ دبا لیتے ہیں یا موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا طبقہ اشرافیہ' جسیم سین جوشی کے ساتھ محمد رفیع کے بارے میں کچھ کہنے میں جھجک محسوس کرتا ہے۔ تو کیا 'پاپولر' کو صرف اس لیے نکال باہر کیا جائے کہ عوام نے اسے پسند کیوں کیا۔ ترقی پسند حضرات کو اس پر اور بھی زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔"

کاش کہ کوئی اس بارے میں سوچے کہ شہر کراچی کی جہاں ابن صفی تمام عمر قیام پذیر رہے اور اب اسی کی مٹی میں سو رہے ہیں' کوئی سڑک' فلائی اوور یا کسی عمارت کا

نام ان کے نام پر رکھ دیا جائے۔ اسی طرح کراچی یونیورسٹی کو چاہیے کہ ابن صفی پر باقاعدہ تحقیقی کام شروع کرائے کہ اس سے فن جاسوسی ناول نگاری کے خدو خال ابھر کر سامنے آئیں گے۔

ابن صفی کی ادبی حیثیت کا تعین نہ ہو سکا۔ ابن صفی اور جاسوسی ادب سے ادب کے ٹھیکیداروں کی الرجی ختم نہ ہو سکی۔ جدید جاسوسی ادب کی تاریخ ابن صفی کو بھی فراموش نہ کر سکے گی اور اگر اس گناہ کی مرتکب ہوئی تو اس کا حشر بھی ان نقالوں کا سا ہوگا جو ابن صفی کے نام کے قافیے سے ملتے جلتے نام رکھ کر پڑھنے والوں کو دھوکا دیتے رہے ہیں۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی اطاعت سے مسلسل روگردانی کرتی ہے تو آخر کار غیرت الٰہی جوش میں آ جاتی ہے اور طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے ہیں لیکن جس قوم کو سب سے بڑھ کر عبرتناک سزا دینا مطلوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو مسخ کر دیتا ہے اور ایسے لوگ اپنی شناخت گم کر دیتے ہیں۔ اردو ادب کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کا چہرہ بھی مسخ ہو گیا ہے۔ ان کی شناخت گم ہو گئی ہے! جہاں قول، فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا ہوا چھوڑ آئے وہاں حرف اپنی حرمت و تاثیر کھو دیتا ہے۔

ابن صفی ایک ایسا بت تھے جسے توڑنے کی، مایوس و پژمردہ کرنے کی، نیچا دکھانے کی اور اس کی نقالی میں قارئین کو گمراہ کرنے کی بڑے بڑے بت شکنوں نے تمام عمر سعی کی تھی۔ مگر جب ایسے لوگوں کے ہتھوڑے اور تیشے اس بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ستانے لگتے تھے وہ ٹکڑے از سر نو اکٹھا ہو کر اس خوب صورت بت کی صورت اختیار کر لیتے تھے جس کا نام ابن صفی ہے اور جو اپنے تنقیص نگاروں کو مخاطب کر کے اپنی نرم، شیریں اور مدھم آواز میں کہتا ہے۔

فہم و فراست خواب کی باتیں
جاگتی دنیا پاگل ہے
عقل کا سورج ماند ہوا ہے
ذروں کی بن آئی

ابن صفی نے جس مسلک کج کلاہی کی سمت ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کر لیا، پھر اسے تاعمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہد وفا میں علاج گردش لیل و نہار ڈھونڈا اور یہ انہوں نے اس زمانے میں کیا جب اردو زبان کے سری ادب کو تازہ خون کی اشد ضرورت تھی۔ کتنے ایسے ہیں جو قریباً نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ابن صفی کے چنے ہوئے راستے سے ادب کے رہنماؤں کو اختلاف رہا ہے لیکن اپنی تحریروں کے ذریعے اردو زبان کے پھیلاؤ، قانون کا احترام اور پڑھنے والوں کی ذہنی و فکری تربیت جیسے کام جس پامردی و استقامت سے انہوں نے کیے وہ لائق تحسین و تکریم ہیں۔ ابن صفی اس طرح جیے جس طرح جینا چاہیے اور یوں شتابی سے رخصت ہوئے جس طرح وہ رخصت ہونا چاہتے تھے۔

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف وداع کی صورت
للہ الحمد! با انجام دل زدگاں
کلمہ شکر بنام لب شیریں دہناں

ابن صفی کے ادبی مقام کا تعین کرنا ہماری سب سے بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے۔